3

# اپنے زمانہ کی اہمیت کو سمجھو
# اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاؤ

(فرمودہ 21 جنوری 1944ء بمقام لاہور)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"انسانی فطرت کچھ اس قسم کی ہے کہ انسان بار بار کے تجربہ کے باوجود وہ اپنے لیے ایک ایسی عادت اور ایسا دستور العمل نہیں بنا سکتا کہ وہ اپنے وقت پر کسی چیز کے فوائد کو حاصل کر سکے۔ پہلے تو وہ ایک عرصہ اس بات میں ضائع کر دیتا ہے کہ جو چیز اس کے سامنے آئی ہے آیا وہ کوئی اہمیت رکھتی بھی ہے یا نہیں رکھتی۔ پھر کچھ عرصہ وہ اس بات میں گزار دیتا ہے کہ وہ چیز اگر اہمیت رکھتی ہے تو اس کی اہمیت نیک ہے یا بد۔ پھر جب وہ اس کی اہمیت کو سمجھ لیتا ہے مثلاً اس کے متعلق یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ نیک اہمیت رکھتی ہے اُس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو پھر وہ ایک عرصہ اس بات کا اندازہ لگانے میں صَرف کر دیتا ہے کہ وہ نیک اہمیت کتنا درجہ رکھتی ہے۔ اور بسا اوقات جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ نیک اہمیت اتنی اہم اور ضروری ہے کہ نہ صرف وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کے لیے بلکہ آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے بھی ایک بہت بڑا خدائی فضل اور خدائی انعام ہے تو اُس وقت تک وہ اہمیت رکھنے والی چیز دنیا سے گزر چکی

ہوتی ہے۔ آج ہمیں لاکھوں کروڑوں یہودی اس بات کے لیے تکلیف اٹھاتے نظر آتے ہیں کہ وہ دینِ موسوی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی تجارتیں توڑی جاتی ہیں، ان کے مکان اور جائیدادیں ضبط کی جاتی ہیں، انہیں قتل کیا جاتا ہے، انہیں ملک بدر کیا جاتا ہے مگر وہ موسوی دین کے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حالانکہ موسوی دین کے ساتھ اب ان کا تعلق صرف سطحی رہ گیا ہے، حقیقی نہیں۔ اگر موسیٰؑ کی صحیح امت دنیا میں موجود ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کا زمانہ اس سے اَور پیچھے جا پڑتا جس زمانہ میں آپ ظاہر ہوئے۔ بلکہ اگر موسیٰؑ کی امت حقیقی موجود ہوتی تو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آنے کی بھی اُس وقت ضرورت نہ ہوتی جب آپ مبعوث ہوئے۔ تو جو حقیقی تعلق موسوی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا وہ ہزاروں سال اپنے اصل مقام سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔ کم سے کم دو ہزار سال سے وہ تعلق قطع ہو چکا تھا۔ مگر باوجود اِس کے کہ وہ حقیقی تعلق کھو چکے تھے اس تعلق کی اہمیت اُن کے دلوں میں رہ گئی۔ اور اس اہمیت کے احساس کا صحیح طریق اب انہیں یہی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی جائیدادوں سے بے دخل ہو جائیں، اپنے وطنوں سے الگ ہو جائیں، اپنے مال و اسباب کو قربان کر دیں، اپنی جانوں کو ہلاک کر دیں مگر موسوی دین سے ان کا جو اتصال ہو چکا ہے اس پر کوئی زَد نہ آنے دیں۔ لیکن وہی قوم جو آج صحیح طور پر موسوی تعلیم کو بھی نہیں سمجھتی، جو اس تعلیم پر عمل بھی نہیں کرتی جو اُسے دی گئی صرف اس کی اہمیت کا اثر اس کے دل پر باقی رہ گیا ہے۔ ایک زمانہ میں جبکہ یہ قوم صحیح طور پر موسوی تعلیم پر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی جبکہ موسوی دین سے اس کا تعلق موجودہ تعلق سے یقیناً ہزاروں گُنا بڑھ کر تھا جبکہ موسیٰؑ کی تعلیم کے زیر اثر اللہ تعالیٰ سے اتصال کی کوشش اس کا شب و روز کا کام تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ موسیٰؑ کے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرنا کس قدر ضروری اور ان کی قومی زندگی کے لیے کیسا مفید ہے۔ بلکہ ایک موقع پر جب موسیٰؑ کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرو تو موسوی قوم کے لوگوں نے باوجود اِس کے کہ وہ اِس وقت کے یہود سے زیادہ نیک تھے، اِس وقت کے یہود سے زیادہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے خواہش مند تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ

فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ[1] موسیٰ! جان دینا کوئی معمولی بات ہوتی ہے؟ مانا کہ ہمارا تمہارے ساتھ تعلق ہے، مانا کہ ہم تمہیں ایک قیمتی وجود سمجھتے ہیں مگر اتنا قیمتی تو نہیں کہ تمہارے لیے قوم کی قوم کو برباد کر دیا جائے۔ جس جنگ کی آگ میں تم ہم کو جھونکنا چاہتے ہو، جس فتنہ میں تم ہم کو مبتلا کرنا چاہتے ہو وہ تو ایک ایسی خطرناک آگ ہے جو ساری قوم کو بھسم کر دے گی اور تم اتنے قیمتی وجود نہیں کہ تمہارے کہنے پر تمام قوم کو تباہ ہونے دیا جائے۔ آخر تمہارا وجود قوم کے لیے ہے نہ کہ قوم کا وجود تمہارے لیے۔ یہ نقطۂ نگاہ تھا جو اُس وقت کے یہود کا تھا حالانکہ وہ موجودہ یہودیوں سے بہت زیادہ ترقی یافتہ اور بہت زیادہ ایمان رکھنے والے تھے۔ آخر ہم یہ کس طرح مان سکتے ہیں کہ موسیٰ کے ساتھ رہنے والے، دن رات اللہ تعالیٰ کے نشانات دیکھنے والے، اس کے معجزات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے والے اور اس کی تائیدات کے کرشمے اپنی ذات میں دیکھنے والے موجودہ یہودیوں سے اپنے ایمان اور اپنے اخلاص میں کم تھے؟ یقیناً وہ ان سے بڑھ کر تھے اور ہزاروں گنا بڑھ کر تھے۔ مگر وہ جو ساتھ رہنے والے تھے، انہوں نے تو یہ جواب دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ تُو اور تیرا ربّ دونوں جائیں اور جا کر دشمن سے لڑیں ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے۔ مگر آج اس یہودی قوم کے افراد جن کے اعمال اُس زمانہ سے بہت ہی کم ہیں، جن کے ایمان اُس زمانہ کے ایمان سے بہت ہی ادنیٰ ہیں، جن کا اخلاص اُس زمانہ کے لوگوں کے اخلاص کے مقابلہ میں بالکل حقیر اور ہیچ ہے اپنی جانیں بھی قربان کر رہے ہیں، اپنے اموال بھی قربان کر رہے ہیں، اپنے وطن بھی قربان کر رہے ہیں، اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کو بھی قربان کر رہے ہیں، اپنے ملک کو بھی قربان کر رہے ہیں مگر وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ موسیٰ کو چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ وہ اُس چیز کی اہمیت کو آج اُس سے بہت زیادہ سمجھتے ہیں جس قدر اہمیت موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگ سمجھتے تھے۔ گویا علم دماغی تو رہ گیا، موسیٰ کی اہمیت تو ان کے دلوں میں رہ گئی لیکن ایمان اور اخلاص مٹ گیا۔ مگر باوجود ایمان اور اخلاص کے مٹ جانے کے وہ دماغی تعلق جو ان کا حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے تھا اتنا روشن ہوا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے چھڑا نہیں سکتی۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگ بھی موسیٰؑ کی اہمیت پر غور ہی کر

رہے تھے کہ ان کی آزمائش کا وقت آ گیا اور چونکہ انہوں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ موسیٰؑ کی اہمیت کتنا درجہ رکھتی ہے وہ اس امتحان میں فیل ہو گئے اور انہوں نے کہہ دیا کہ جاؤ! تم اور تمہارا ربّ دشمن سے لڑتے پھرو ہم تو نہیں جاسکتے۔ پھر ان پر ایک ایسا زمانہ آیا کہ انہوں نے اپنے دلوں میں موسیٰ کی اہمیت کا فیصلہ کر لیا اور انہوں نے کہا موسیٰؑ کی اہمیت قومی زندگی سے بھی زیادہ ہے۔ بلکہ ہماری قومی زندگی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک موسیٰؑ کی اہمیت کو ہماری قوم کا ہر فرد اچھی طرح نہ سمجھ لے۔ مگر جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلفاء گزر چکے تھے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ابتدائی زمانہ میں ایمان لانے والے اور ان کو دیکھنے والے اتباع بھی گزر چکے تھے۔ اُس وقت وہ ایمان اور وہ اخلاص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ قوم میں پیدا ہوا تھا پھیکا پڑ چکا تھا، اللہ تعالیٰ سے قوم کا تعلق کمزور ہو چکا تھا، اتصال ٹوٹ چکا تھا، محبت اور اطاعت کا جوش سرد ہو چکا تھا۔ اب خالی موسیٰ کی اہمیت ان کو قُربِ الٰہی نصیب نہیں کرا سکتی تھی۔ پس جب تک موسیٰؑ کی اہمیت کے پرکھنے کا وقت تھا، جب تک موسیٰؑ سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی اہمیت کو نہ پرکھا، انہوں نے موسیٰؑ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور جب انہوں نے موسیٰؑ کی اہمیت کو سمجھا تو فائدہ اٹھانے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ پھر وہ ایک عام قوم کی طرح ہو گئے جو صرف زور اور طاقت کے ساتھ بڑھتی ہے ایمان کے ساتھ اس کے بڑھنے کا تعلق نہیں ہوتا۔

یہی حال ہمیں باقی دنیا میں نظر آتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عیسائی پادریوں نے مسیحیت کی اشاعت کے لیے کس قسم کی قربانیاں کی ہیں۔ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ پادری آدم خور علاقوں میں تبلیغ کے لیے گئے اور حبشی انہیں بُھون بھان کر کھا گئے مگر جب مرکز میں تار پہنچا کہ فلاں علاقہ میں ہمارے پادریوں پر ایسا حادثہ گزرا ہے تو ہزاروں عیسائیوں نے اُسی دن اپنے آپ کو اِس غرض کے لیے وقف کر دیا کہ ہم وہاں تبلیغ کی خاطر جانے کے لیے تیار ہیں اور انہوں نے اِس بات کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ اس علاقہ میں مردم خور لوگ رہتے ہیں وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ مگر ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب مسیحؑ کے

ایک مقرب صحابی بلکہ بعد میں ہونے والے خلیفہ کی یہ حالت تھی کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُس نے تکلیف کی حالت میں دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا ہے تو بعض لوگوں نے اُسے دیکھ کر کہا کہ یہ بھی مسیح کے ساتھیوں میں سے ہے۔اِس پر اُس نے کہا میں اس کے ساتھیوں میں سے نہیں، میں تو اُس پر خدا کی لعنت ڈالتا ہوں۔2 مگر پھر یہی شخص اِس واقعہ کے چالیس یا پچاس سال کے بعد روم میں گیا اور اسے مسیحؑ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے پھانسی دے دیا گیا اور وہ خوشی سے ہنستا ہوا صلیب پر چڑھ گیا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں یقیناً اس کا ایمان اُس سے بہت زیادہ تھا جتنا ایمان بعد میں اس کے دل میں تھا۔اُس وقت زندہ خدا کے نشانات ہر وقت آنکھوں کے سامنے پورے ہوتے نظر آتے تھے جو بعد میں عیسوی امت کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ پس جس قسم کا ایمان پطرس کو مسیحؑ کی زندگی میں حاصل تھا یقیناً بعد میں ویسا ایمان اس کے دل میں نہ تھا۔ مگر اُس وقت اُس نے کیوں قربانی نہ کی اور بعد میں کیوں قربانی کی؟اِسی لیے کہ اُس وقت تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی قدروقیمت اور اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے دل نے نہیں لگایا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ چیز کتنی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر بعد میں جب وہ صلیب پر چڑھ گیا تو گو اُس وقت اُس کا ایمان ویسا نہیں ہو گا جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا مگر یہ پختگی ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر یہودی قوم اور وہ قبائل جن کی ہدایت کے لیے آپ مبعوث ہوئے دنیا میں کوئی پائیدار کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ اور یہ کہ دنیا میں تغیر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسیحؑ کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اس کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں قائم کی جائے۔ چنانچہ وہ اِسی اہمیت کی وجہ سے جو اُس کے دل پر نقش ہو چکی تھی خوشی سے صلیب پر چڑھ گیا اور اُس نے اپنی جان کی پروا نہ کی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں جو ایمان انہیں نصیب تھا وہ بعد میں اُس شکل میں نہیں رہا جس شکل میں وہ ایمان آپ کے زمانہ میں انہیں

حاصل تھا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ جس نے اپنی ذات میں خدا تعالیٰ کے نشانات دیکھ لیے اور اس سے تعلق پیدا کرکے مقامِ قُرب حاصل کر لیا وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے متعلق ہی آتا ہے جب آپ وفات پانے لگے تو رونے لگ گئے۔ ان کے بیٹے نے جو بہت بڑے مخلص اور بڑی شان رکھنے والے تھے اور باپ سے پہلے ایمان لائے تھے، ان سے پوچھا کہ آپ روتے کیوں ہیں؟ آپ کو تو خدا تعالیٰ نے اسلام کی خدمت کی بڑی بھاری توفیق عطا فرمائی ہے اور اب ان سب جذبات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اجر ملنے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا تم کو کیا معلوم ہے۔ ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زندہ خدا نظر آیا کرتا تھا مگر بعد میں ہم دنیا کے جھمیلوں میں ایسے گرفتار ہوئے اور ایسے ایسے جھگڑے آ پڑے کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو گیا کہ سچائی کیا ہے۔ اس لیے نہ معلوم ہم اس دوران میں کیا کیا گناہ اور کیا کیا غلطیاں کر چکے ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ مرنے کے بعد میں خدا کو کیا جواب دوں گا۔**3**

تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبیوں کے زمانہ میں انسان کو جو ایمان حاصل ہوتا ہے وہ بعد میں ویسا نہیں رہتا۔ سوائے اُن لوگوں کے جن کا خدا تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کے کلام اور الہام سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ عام لوگ جن کا ایمان ایک دوسرے کو دیکھ کر ہوتا ہے نبی کا زمانہ گزرنے کے بعد اُن کا ایمان اُس رنگ میں نہیں رہتا جس رنگ میں پہلے ہوا کرتا ہے۔ گو اس میں شبہ نہیں کہ نبی کی پیشگوئیوں کو پورا ہوتے دیکھ کر بلکہ بعض دفعہ دوبارہ اور بعض دفعہ سہ بارہ ان کو پورا ہوتے دیکھ کر ایک اَور رنگ کی پختگی ان کے ایمان میں ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ زندہ خدا جو نبی کے زمانہ میں انہیں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے اور خاموش رہتے نظر آیا کرتا تھا بعد میں نظر نہیں آتا۔ سوائے اُن لوگوں کے جن کا خدا تعالیٰ سے ذاتی تعلق ہوتا ہے اور جو خدا تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے اس کی محبت اور تائید کے نمونے اپنی ذات میں بھی اُسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں جس طرح انبیاء کے زمانہ میں وہ ان نشانات کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی بڑی بڑی

قربانیاں کرنے والے لوگ موجود تھے۔ ایسے ایسے لوگ پائے جاتے تھے جن کی مثال آج جماعت میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ایسے بیسیوں آدمی تھے جو اپنے گزارے اتنی تنگی سے رکھتے تھے کہ ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ خوشحال ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے مال کا ایک بہت بڑا حصہ دین کی اشاعت کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھجوادیا کرتے تھے۔ مگر پھر ہم نے انہیں کو دیکھا کہ بعد میں ان کے دلوں میں یہ حسرت پیدا ہوتی گئی کہ کاش! ہم اس سے بھی زیادہ خدمت کرتے۔ حالانکہ ان کی خدمت یقیناً موجودہ لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔ مجھے اس کی ایک مثال یاد ہے۔ چودھری رستم علی صاحب غالباً پہلے سب انسپکٹر تھے پھر خدا تعالیٰ نے ان کو انسپکٹر بنادیا۔ سب انسپکٹری کی تنخواہ میں سے وہ ایک معقول رقم ماہوار چندہ کے طور پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھجوایا کرتے تھے۔ اُس وقت غالباً ان کی اسّی روپے تنخواہ تھی۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کو انسپکٹر بنادیا اور ان کی ایک سَو اسّی روپے تنخواہ ہو گئی۔ جب ان کا خط آیا، اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بیمار تھے۔ میں نے خود اُن کا خط پڑھ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنایا۔ انہوں نے خط میں لکھا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے عُہدہ میں ترقی دے کر تنخواہ میں ایک سَو روپیہ کی زیادتی عطا فرمائی ہے۔ مجھے اپنے گزارہ کے لیے زیادہ روپوں کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ نے میری تنخواہ میں یہ اضافہ محض دین کی خدمت کے لیے کیا ہے اس لیے میں آئندہ علاوہ اُس چندہ کے جو میں پہلے ماہوار بھیجا کرتا ہوں یہ سَو روپیہ بھی جو مجھے ترقی کے طور پر ملا ہے ماہوار بھیجتا رہوں گا۔

دیکھو! اس قسم کے نمونے آجکل کتنے نادر ہیں۔ مگر اُس وقت کثرت سے جماعت میں اس قسم کے نمونے پائے جاتے تھے۔ لیکن میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد ان کو دیکھا کہ ان کے دل اِس بات پر خوش نہیں تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ کافی تھا بلکہ بعد میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود اُس سے بہت زیادہ اہم تھا جتنا انہوں نے سمجھا اور اُس سے بہت زیادہ آپ کے وجود پر دنیا کی ترقی کا انحصار تھا جس قدر انہوں نے پہلے خیال کیا تو ان کے دل روتے تھے کہ کاش!

انہیں یہ بات پہلے معلوم ہوتی اور وہ اس سے بھی زیادہ خدمت کرسکتے۔ مگر پھر انہیں یہ موقع نصیب نہ ہوا اور وقت ان کے ہاتھ سے چلا گیا۔ اِسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں کئی لوگ ایسے تھے جنہیں قادیان میں صرف دو تین دفعہ آنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے دل میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے بڑا فضل کیا کہ ہمارا قادیان سے تعلق پیدا ہو گیا اور ہم نے زمانہ کے نبی کو دیکھ لیا۔ مگر آج اس چیز کی اس قدر اہمیت ہے کہ ہماری جماعت میں سے کئی لوگ ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ یاد کرکے بڑی خوشی سے یہ کہنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ کاش! ہماری عمر میں سے دس یا بیس سال کم ہو جاتے لیکن ہمیں زندگی میں صرف ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ تو جنہیں زندگی میں آپ کو دیکھنے کا موقع ملا گو انہوں نے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مگر بہر حال انہوں نے اس کی اہمیت کا اُتنا اندازہ نہ کیا جتنا اندازہ انہیں کرنا چاہیے تھا۔

اِس بارہ میں سب سے زیادہ صحیح اندازہ لگانے والی قوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ ہیں۔ ان کی زندگیوں پر غور کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں قریباً تکمیل کے مقام تک پہنچ چکے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اہمیت کو انہوں نے ایسا سمجھا کہ انہوں نے آپ کے لیے کسی قسم کی قربانی کرنے سے دریغ نہ کیا۔ لیکن پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کی جو عظیم الشان برکات تھیں، آپ کی زندگی کی جو اہمیت تھی اگر اُس پر پورا غور کیا جاتا تو صحابہؓ اُس مقام سے بہت اونچے ہوتے جو انہیں حاصل تھا اور اُس سے بہت زیادہ قربانیاں کرنے والے ہوتے جتنی قربانیاں انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں کیں۔

اب اِس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مبارک زمانہ ہمیں ملا ہے اور ہمارے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وقت پر اس چیز کی اہمیت کو سمجھتے ہیں جس اہمیت کا سمجھنا ہمارے لیے دینی و دنیوی برکات کا موجب ہو سکتا ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ تو گزر گیا۔ اب آپ کے خلفاء اور صحابہؓ کا زمانہ ہے۔

مگر یاد رکھو! کچھ عرصہ کے بعد ایک زمانہ ایسا آئے گا جب چین سے لے کر یورپ کے کناروں تک لوگ سفر کریں گے، اس تلاش، اِس جستجو اور اِس دُھن میں کہ کوئی شخص انہیں ایسا مل جائے جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بات کی ہو۔ مگر انہیں کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا۔ پھر وہ کوشش کریں گے کہ انہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بات نہ کی ہو صرف مصافحہ ہی کیا ہو۔ مگر انہیں ایسا شخص بھی کوئی نہیں ملے گا۔ پھر وہ کوشش کریں گے کہ انہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بات نہ کی ہو، آپ سے مصافحہ نہ کیا ہو، صرف اُس نے آپ کو دیکھا ہی ہو۔ مگر انہیں ایسا بھی کوئی شخص نظر نہیں آئے گا۔ پھر وہ تلاش کریں گے کہ کاش! انہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جس نے گو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بات نہ کی ہو، آپ سے مصافحہ نہ کیا ہو، آپ کو دیکھا نہ ہو مگر کم سے کم وہ اُس وقت اتنا چھوٹا بچہ ہو کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس کو دیکھا ہو مگر انہیں ایسا بھی کوئی شخص نہیں ملے گا۔ لیکن آج ہماری جماعت کے لیے موقع ہے کہ وہ ان برکات کو حاصل کرے۔ آج بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے وہ دروازہ کھلا ہے جس سے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی قریب ترین برکات جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی برکات سے دوسرے نمبر پر ہیں، بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو اس چیز کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، وہ اِسی دُھن میں رہتے ہیں کہ افسوس انہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہ ملا، افسوس وہ ان برکات سے محروم رہ گئے اور اس حسرت و افسوس میں وہ دوسری برکت جو اِن کو حاصل ہوتی ہے اور جس سے فائدہ اٹھانا ان کے امکان میں ہوتا ہے وہ بھی ان کے ہاتھ سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ رسّہ کھنچتا چلا جاتا ہے، وقت گزرتا چلا جاتا ہے، فائدہ اٹھانے کا زمانہ ختم ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے مگر وہ پہلی برکت کے نہ ملنے پر ہی افسوس کرتے رہتے ہیں اور موجودہ برکت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ اِس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ جب ان کے دل اس افسوس سے تھک جائیں گے کہ انہیں کیوں پہلی برکت سے حصہ لینے کا موقع نہ ملا اور وہ کہیں گے اگر پہلی برکت نہیں ملی تو آؤ اَب

دوسرے درجہ کی برکت سے ہی حصہ لے لیں تو اُس وقت وہ دوسرے درجہ کی برکت بھی جاچکی ہو گی۔ پھر وہ اس بات پر افسوس کرنے لگ جائیں گے کہ ہمیں دوسرے درجہ کی برکت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملا اور جو تیسرے درجہ کی برکت ان کے سامنے ہو گی اُس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں گے۔ آخر جب وہ فیصلہ کریں گے کہ چلو اگر دوسرے درجہ کی برکت نہیں ملی تو تیسرے درجہ کی برکت سے ہی فائدہ حاصل کریں تو اُس وقت تیسرے درجہ کی برکت بھی جاچکی ہو گی اور چوتھے درجہ کی برکت آچکی ہو گی۔ اُس وقت وہ پھر تیسرے درجہ کی برکت سے فائدہ نہ اٹھانے پر افسوس کریں گے اور افسوس کرتے چلے جائیں گے مگر انہیں یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ اب چوتھے درجہ کی برکت سے ہی فائدہ حاصل کر لیں۔ آخر ایک لمبے عرصہ کے بعد جب ان کے دل فیصلہ کریں گے کہ اگر تیسرے درجہ کی برکات سے ہم حصہ نہیں لے سکے تو چوتھے درجہ کی برکت سے ہی فائدہ اٹھائیں تو اُس وقت چوتھے درجہ کی برکت بھی آسمان پر جاچکی ہو گی۔ پھر وہ چوتھے درجہ کی برکات نہ ملنے پر افسوس کریں گے اور یہ زمانۂ افسوس اتنا لمبا ہو گا کہ اس عرصہ میں وہ پانچویں درجہ کی برکت سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ آخر جب وہ فیصلہ کریں گے کہ اگر ہمیں پہلے درجہ کی برکت نہیں ملی، دوسرے درجہ کی برکت نہیں ملی، تیسرے درجہ کی برکت نہیں ملی، چوتھے درجہ کی برکت نہیں ملی تو آؤ ہم پانچویں درجہ کی برکت سے ہی فائدہ حاصل کریں تو کیا دیکھیں گے کہ وہ پانچویں درجہ کی برکت بھی گزر چکی ہے۔ غرض جیسے جیسے خدا تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف برکات رکھی ہیں اور ان برکات کے مختلف مدارج مقرر کیے ہیں اس طرح وہ برکات ظاہر تو ہوتی رہیں گی مگر ایسے لوگ جو وقت پر کسی چیز کی پوری اہمیت نہیں سمجھتے جب وقت گنوا دیتے ہیں اُس وقت توجہ کرتے ہیں۔ پہلی برکت کے نہ ملنے کا دوسری برکت کے زمانہ میں افسوس کرتے ہیں اور دوسری برکت کے نہ ملنے کا تیسری برکت کے زمانہ میں افسوس کرتے ہیں اور تیسری برکت کے نہ ملنے کا چوتھی برکت کے زمانہ میں افسوس کرتے ہیں اور چوتھی برکت کے نہ ملنے کا پانچویں برکت کے زمانہ میں افسوس کرتے ہیں اور پانچویں برکت کے نہ ملنے کا چھٹی برکت کے زمانہ میں افسوس کرتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے مگر وہ کسی ایک برکت سے

بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لیکن مومن وہ ہوتا ہے جو اپنی سابقہ کوتاہی پر جہاں افسوس کا اظہار کرتا ہے وہاں موجودہ نعمت کو وہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اسلام کی جو تشریح ہمیں معلوم ہوئی ہے، جو علوم خدا نے ہم پر کھولے ہیں، جو معارف اُس نے ہمیں سکھائے ہیں اور جو باتیں ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں بیٹھ کر سیکھی ہیں آج دنیا اُن کا کہاں مقابلہ کرسکتی ہے۔ لیکن اگر ہم میں سے ایک حصہ نے وہ زمانہ نہیں دیکھا تو اُسے اب وہ معارف اور علوم ہم سے سیکھ کر دوسرے درجہ کی نعمت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دوسرے درجہ کی نعمت بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

میں نے بتایا ہے کہ یہ زمانہ ایسا ہے جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ ابھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جبکہ خلافت کا نظام ہماری جماعت میں خدا تعالیٰ کے فضل سے قائم ہے اور جبکہ خلافت کے نظام پر وہ لوگ فائز ہوئے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابیؓ ہیں۔ پس اِس وقت سے فائدہ اٹھانے کا جن لوگوں کو موقع نصیب ہے اگر وہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور جو خدا تعالیٰ کی مشیّت کے ماتحت انہیں نصیب نہیں ہوا اُس پر افسوس کرتے ہوئے اپنی عمریں گزار دیتے ہیں تو ممکن ہے بلکہ غالب امر یہ ہے کہ وہ پہلے زمانہ کی طرح اِس دوسرے زمانہ کی برکات کو بھی کھو دیں گے۔ پس ہمارے دوستوں کو اس امر کی اہمیت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے اور انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی ان کی زندگیوں میں فائدہ اٹھانے کے اہم مواقع موجود ہیں۔ اگر پہلا زمانہ انہوں نے اپنی غفلت سے کھو دیا ہے یا خدا تعالیٰ نے وہ زمانہ انہیں نصیب نہیں کیا تو اب دوسرا زمانہ کھودینے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلانے کا اس وجہ سے خیال پیدا ہوا کہ میں ایک مجبوری کی وجہ سے قریباً ایک مہینہ سے لاہور میں موجود ہوں۔ مگر میں نے دیکھا ہے لاہور کے بہت ہی کم دوستوں نے میری موجودگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ میں باہر آخر ایک ہی وقت میں بیٹھ سکتا ہوں۔ گو اِس کے علاوہ نمازیں پڑھانے کے لیے بھی میں آتا جاتا ہوں مگر لاہور کے بہت ہی کم لوگ ہیں جو اِس موقع پر آتے رہے ہیں۔ شاید وہ اپنے

دلوں میں بہت دفعہ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ انہیں نہ ملا۔ اگر ملتا تو ہم یوں کرتے اور اس اس طرح فائدہ اٹھاتے۔ مگر ان کی ان خواہشات کا باطل اور غلط ہونا اِسی سے ثابت ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت حاصل کرنے کا جو دوسرا موقع ملا اس سے انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر واقع میں ان کے دلوں میں دین کی اہمیت اور اس کی عظمت کا احساس ہوتا تو جو چیز اُن کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اُس پر افسوس کرنے کی بجائے جو چیز موجود تھی اس سے فائدہ اٹھاتے۔ ☆

میں نے دیکھا ہے کہ کئی دوست اِس خیال میں رہے ہیں اور بعض سے میں نے پوچھا تو انہوں نے جواب بھی یہی دیا کہ جگہ تھوڑی ہے وہاں زیادہ لوگ نہیں آسکتے۔ لیکن میرے نزدیک گو وہ چھوٹی جگہ ہے پھر بھی اگر دوست آنا چاہتے تو باری باری آکر سب فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ آخر تھوڑی جگہ میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ جماعت کے سب دوست اکٹھے ہو سکیں۔ ایسی صورت میں فائدہ اٹھانے کا طریق یہی ہوتا ہے کہ باری باری لوگ فائدہ اٹھالیں۔ پس بے شک وہ جگہ چھوٹی ہے اور سب دوست وہاں نہیں آسکتے لیکن اگر ان کے دلوں میں فائدہ حاصل کرنے کی خواہش اور تڑپ ہوتی تو بعض لوگ ایک دن فائدہ اٹھالیتے، بعض دوسرے دن فائدہ اٹھالیتے اور بعض تیسرے دن فائدہ اٹھالیتے۔ اس طرح جگہ کی تنگی کا سوال بھی حل ہو جاتا اور فائدہ بھی سب جماعت کو پہنچ جاتا۔

**یاد رکھو! خدا تعالیٰ کے انبیاء اور ان کے خلفاء جب کسی جگہ جاتے ہیں تو وہاں کے رہنے والوں کے لیے ایک رنگ میں ابتلاء کا بھی موجب ہوتے ہیں۔ یہاں کی جماعت کے دوست خیال کرتے ہوں گے کہ ہمیں مرکز میں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ہم مرکز میں رہتے تو یوں دین کی خدمت کرتے اور یوں علمی اور روحانی باتوں کے پھیلانے میں حصہ لیتے۔ مگر کسی**

---

☆ اِس خطبہ کے بعد جماعت لاہور نے خاص طور پر نماز کی جماعت کے وقت میں آنا شروع کردیا اور جہاں تک ہوسکا میری موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔ منہ

زمانہ میں خدا تعالیٰ خود لوگوں کے گھروں میں مرکز کو لے آتا ہے اور پھر اُن سے پوچھتا ہے کہ اب بتاؤ تم نے کیا فائدہ اٹھایا۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے وقت میں اتنی اہم نظر نہیں آتیں لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہی چیزیں عظیم الشان اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ آج کئی دینی مسائل خدا تعالیٰ ہماری زبانوں سے اِس طرح آسانی کے ساتھ حل کرا دیتا ہے کہ لوگوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ دین کے اہم ترین مسائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں ان باتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن ایک زمانہ آئے گا جب بڑے بڑے عالم، بڑے بڑے سمجھدار اور بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ رکھنے والے ان باتوں کی تلاش کریں گے اور انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ ان مسائل کا کیا حل ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حدیثیں بیان فرمایا کرتے تھے اُس وقت کتنے صحابی تھے جنہوں نے اِس کی اہمیت کو سمجھا۔ عام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ تو ہماری فطرت کے مطابق باتیں ہیں کون ہے جسے ان باتوں کا بھی علم نہیں ہو سکتا اور کون ہے جو ان کا انکار کر سکتا ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا گئے اور چند صحابہؓ، جنہوں نے اس چیز کی اہمیت کو سمجھا تھا انہوں نے حدیثیں بیان کرنا اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر پھر ایک ایسا زمانہ آیا جب حدیث اتنی نایاب ہو گئی کہ بعض محدثین کو ایک ایک حدیث دریافت کرنے کے لیے ہزار ہزار، دو دو ہزار میل کا سفر کرنا پڑا۔ موجودہ زمانہ میں جو سہولتیں سفر کرنے میں لوگوں کو میسر ہیں اِن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ہزار دو ہزار میل کا سفر ایسا ہی تھا جیسے کوئی دنیا کے گرد چکر لگانے کے لیے چل پڑے۔ یا یہاں سے پیدل چل کر امریکہ جائے اور پھر وہاں سے واپس آئے۔ بعض محدثین بخارا سے قیروان تک ایک ایک حدیث معلوم کرنے کے لیے گئے ہیں۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں کتنے لوگ تھے جنہوں نے حدیثوں کی اہمیت کو سمجھا۔ صرف تین چار صحابی ایسے نظر آتے ہیں جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے اور دوسروں کو سنانے کا غیر معمولی اشتیاق تھا۔ ان میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے آخری چند سالوں میں ایمان لائے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے جو کثرت سے حدیثیں سنتے اور بیان کرتے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو حدیثیں لکھنے کا بھی شوق تھا اور انہوں نے بہت سی حدیثیں لکھ رکھی تھیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ان کو جلا ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ غلطی سے ان کو قرآن سمجھ لیں۔ غرض یہ تین صحابیؓ خصوصیت سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ ان سے نیچے اُتر کر دو تین درجن اَور صحابیؓ ہیں جن سے متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر پھر ان سے نیچے اتر کر کسی صحابیؓ سے ایک اور کسی سے دو حدیثیں پائی جاتی ہیں اور کسی سے ایک حدیث بھی مروی نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ جیسے آدمی سے بہت محدود روایتیں آتی ہیں۔ مگر اس کمی کی وجہ اَور تھی۔ عورتوں میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کثرت سے روایتیں ہیں۔ غرض یہ صرف چھ سات آدمی ہیں جنہوں نے احادیث کی اہمیت کو سمجھا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ بعد میں آنے والے لوگوں تک ان باتوں کو پہنچا دینا ہمارا فرض ہے۔ اگر یہ پانچ سات صحابہؓ بھی یہی سمجھتے کہ یہ مجلسیں قیامت تک چلی جائیں گی اور ہمیشہ ان باتوں کے سننے اور سنانے والے موجود رہیں گے تو ہم اس قیمتی ذخیرہ کو کہاں سے حاصل کر سکتے۔ دنیا میں نہ کوئی مجلس قیامت تک رہی ہے اور نہ باتیں سنانے والے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ آخر ایک دن مجلسیں ختم ہو جاتی ہیں، باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر لوگوں کے دلوں میں سوالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں، پھر لوگوں کے دلوں میں شبہات اور وساوس پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور ان وساوس اور شبہات کا ردّ کرنے والا اور ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بے شک رستہ موجود ہوتا ہے مگر اس رستے پر چلنے کا خیال کسی کو نہیں آتا۔ رستہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرے۔ پھر اس طرح دل کی کھڑکی کُھل جاتی ہے کہ جو مشکلات ہوں وہ آپ ہی آپ حل ہو جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد بڑے بڑے تاریک زمانے آئے۔ ایسے ایسے زمانے آئے جب علوم مِٹ گئے، روشنی جاتی رہی، ظلمت اور تاریکی پھیل گئی لیکن ایسے تاریک زمانوں میں بھی بعض لوگوں نے جب خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسے ایسے علوم پائے کہ اُن کے ذریعہ سے اپنے زمانہ کی تمام تاریکیوں کو انہوں نے دور کر دیا۔ انہی بزرگوں میں سے ایک حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں بہت سا باطل جو پھیل

چکا تھا اللہ تعالیٰ سے نور حاصل کر کے دور کیا۔ اسی طرح اس میدان کے ایک مشہور پہلوان حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہوئے ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی بہت گند تھا، دین سے نفرت پائی جاتی تھی اور اسلامی احکام کی غلط ترجمانی کی جاتی تھی۔ انہوں نے خدا تعالیٰ سے براہ راست تعلق پیدا کر کے اس ظلمت کو مٹانے کے لیے جو علوم حاصل کیے اُن کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر آسمانی علوم کی جو بارش اللہ تعالیٰ نے برسائی اس کا کچھ ترشّح ایک دو صدیاں پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اگر وہ علوم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیان کردہ علوم اور مطالبِ قرآنی تک نہیں پہنچے تو کم سے کم اُن کے قریب ضرور پہنچ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ زمانہ میں ایسے مفاسد بھی پیدا ہو چکے تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے زمانہ میں نہیں تھے اور اِس وجہ سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کے لیے جن علوم پر روشنی ڈالی وہ اُن کے وہم وخیال میں بھی نہیں آئے اور نہ آسکتے تھے۔ لیکن بہر حال خدا تعالیٰ کے تعلق اور اس کے قُرب نے ان پر وہ علوم ظاہر کیے جو زمانۂ نبوت سے بُعد کی وجہ سے مِٹ چکے تھے اور دنیا اُن سے ناواقف ہو چکی تھی۔ گویا وہ زنجیر جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان اتّصال پیدا کرنے کے لیے قائم تھی اور جو زنجیر ایک لمبے عرصے سے لوگوں کی بداعمالی کی وجہ سے کٹ چکی تھی اس زنجیر کے ٹکڑے انہوں نے از سرِ نَو جوڑ کر خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کیا اور نئے سرے سے پھر آسمان سے گمشدہ علوم کو واپس لائے۔

پس بے شک یہ راستہ کُھلا ہے اور قیامت تک کُھلا رہے گا۔ اگر خدا اس دروازہ کو بند کر دے تو نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ دنیا کو روحانی زندگی عطاء کرنے کا خواہشمند نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دنیا میں سے کتنے ہیں جو اس قسم کی قربانی کرتے اور اپنی نفسانی خواہشات کو کچل کر خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرتے ہیں؟ کم اور بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے اور دنیا کُلّی طور پر تاریکی میں مبتلا چلی جاتی ہے۔ پس بہتر اور آسان طریق دنیا کی ترقی کا یہی ہے کہ اس زنجیر کو نہ

ٹوٹنے دیا جائے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان قائم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ، حضرت ولی اللہ شاہ صاحب دہلویؒ، حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ، حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ اور اَور بہت سے بزرگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے دنیا کو تاریکی سے نکالا اور اسے آسمانی نور سے منور کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ زنجیر قائم رہتی، اگر نیکی کا تسلسل قائم رہتا، اگر ایسا ہوتا کہ جیسے ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ ہوئے، عمرؓ کے بعد عثمانؓ ہوئے، عثمانؓ کے بعد علیؓ ہوئے۔ اِسی طرح یہ سلسلہ چلتا اور چلتا چلا جاتا تو حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ، حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ اور حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کو وہ تکالیف اور وہ مشکلات برداشت نہ کرنی پڑتیں جو تکالیف اور مشکلات انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں برداشت کیں۔ اور نہ صرف ان کو وہ مصیبتیں جھیلنی نہ پڑتیں بلکہ مسلمانوں کی روحانیت کو اُس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچتا جتنا فائدہ اس زنجیر کے ٹوٹ جانے کے بعد مسلمانوں کو پہنچا۔ کیونکہ زنجیرِ نبوت سلامت ہوتی اور مسلمانوں کے ہاتھ خدا کے ہاتھ میں رہتے۔ پھر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ گو ان لوگوں نے بڑی بڑی محنتیں کیں اور گم شدہ علوم کو یہ لوگ آسمان سے واپس لائے۔ لیکن یہ لوگ جماعتوں کو واپس نہیں لائے۔ بے شک ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تقوٰی اور روحانیت اور علومِ آسمانی کے حاصل کرنے میں ان لوگوں نے اتنی محنتیں کیں اور اِس قدر قربانیاں کیں کہ ان کا قدم صحابہؓ کے قدم سے جا ملا۔

مَیں اس بات کا قائل نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کوئی شخص صحابہؓ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے نزدیک یہ بالکل باطل خیال ہے اور دنیا میں مایوسی پیدا کرتا اور خدا تعالیٰ کی محبت دلوں میں سے کم کرتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ، حضرت ولی اللہ شاہ صاحب دہلویؒ، حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ، حضرت سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ اور اَور بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو کئی صحابہؓ سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ میرے خیال میں یقیناً کئی صحابہؓ سے بڑھ کر تھے۔ لیکن باوجود اِس کے کہ یہ اپنے ایمان اور اپنی قربانیوں کی وجہ سے صحابہؓ میں جا شامل ہوئے پھر بھی انہوں نے دنیا میں

صحابہؓ کی سی جماعتیں پیدا نہیں کیں۔ اِنہوں نے بے شک کتابیں لکھ دیں، علوم کے دروازے کھول دیئے، شیطان کے حملوں کا ردّ کر دیا لیکن صحابہؓ جیسی کام کرنے والی کوئی جماعت پیدا نہ کر سکے۔ یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب تسلسل قائم ہوتا اور زنجیرِ نبوت سلامت ہوتی۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد زنجیرِ نبوت کو ٹوٹنے نہ دیا جاتا، پیچھے آنے والے پہلوں سے علوم حاصل کرتے اور وہ ان علوم کو اپنی آئندہ نسلوں تک پہنچا دیتے تو گو صحابہؓ سے کم درجہ کی جماعتیں پیدا ہوتیں مگر بہر حال وہ جماعتی طور پر صحابہؓ کے رنگ میں رنگین ہوتیں اور ہر ملک اور ہر علاقہ میں وہ عوام کی بہتری کا ذریعہ بن جاتیں۔ قوم میں سے کسی خاص شخص کا بڑا ہو جانا یا چند اشخاص کا کوئی اعلیٰ اعزاز حاصل کر لینا زیادہ اہم بات نہیں ہوا کرتی۔ یورپ میں ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جن کی آمدنی کلکتہ اور بمبئی کے بعض تاجروں سے بہت کم ہے۔ انگلستان کا ایک کثیر حصہ کلکتہ اور بمبئی کے بعض تاجروں سے کم مالدار ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہمارا ملک انگریزوں کی دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہاں عوام اچھی حالت میں ہیں اور یہاں صرف چند کروڑ پتی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں تمام مسلمان اونچے مقام پر تھے لیکن حضرت ولی اللہ شاہ صاحب دہلویؒ کے زمانہ میں اگر ایک مسلمان آسمان پر بھی چڑھ گیا تو کیا ہوا، باقی لوگ تو غلاظت کے ڈھیروں پر ہی کھڑے تھے۔ پس سوال یہ ہے کہ حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ، حضرت ولی اللہ شاہ صاحب دہلویؒ، حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ اور سید عبد القادر صاحب جیلانیؒ کے زمانہ میں کتنے لوگ تھے جن کے دلوں میں انہوں نے تغیر پیدا کیا؟ کتنے لوگ تھے جنہیں انہوں نے زمینی سے آسمانی بنا دیا؟ کتنے لوگ تھے جو ان کے ذریعہ اسلام کی خدمت کے لیے تیار ہوئے؟ بے شک کچھ لوگ انہوں نے ایسے بھی تیار کیے جو اپنے دلوں میں اسلام کا درد رکھتے تھے، جو اسلام کی اشاعت کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن بہر حال یہ چند افراد تھے۔ مگر نبوت کا زمانہ وہ ہوتا ہے جو چند لوگوں کے قلوب میں نہیں ہزاروں لاکھوں قلوب میں تغیر پیدا کر دیا کرتا ہے۔ پس اگر اس کڑی کو ٹوٹنے نہ دیا جائے تو عوام میں سے بیشتر وہی روح اپنے اندر رکھنے والے ہوں گے جو زمانۂ نبوت میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے لیکن جب وہ کڑی

ٹوٹ جائے تو اس کے بعد بے شک امتِ محمدیہ میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہو جائیں بلکہ میں کہتا ہوں اگر بعض وقتوں میں ابو بکرؓ سے بھی بڑے لوگ پیدا ہو جائیں تو بھی اسلام کو وہ شوکت نصیب نہیں ہو سکتی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں اسے نصیب تھی۔ اس لیے کہ گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بھی ایک ہی ابو بکرؓ تھا، ایک ہی عمرؓ تھا، ایک ہی عثمانؓ تھا، ایک ہی علیؓ تھا۔ لیکن اکثر مسلمان ایسے تھے جن کے دلوں میں ایمان تازہ تھا اور جو اللہ تعالیٰ کا عشق اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ پس گو وہ ابو بکرؓ نہ تھے، گو وہ عمرؓ نہ تھے، مگر وہ سارے مسلمان چھوٹے چھوٹے درجہ کے ابو بکرؓ اور چھوٹے چھوٹے درجہ کے عمرؓ تھے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام اور اپنے اپنے درجہ کے لحاظ سے ایک چھوٹا محمدؐ تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اس لیے وہ تغیر جو یہ لوگ پیدا کر سکتے تھے بعد میں پیدا نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اکیلے تھے جماعتیں ان کے ساتھ نہ تھیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ ساروں میں ایسا تغیر پیدا کر دیا جو دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے کا موجب بن گیا۔

پس اپنے زمانہ کی اہمیت سمجھنے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب بھی جو اخلاص کی روح ہماری جماعت میں موجود ہے اگر یہ اِسی طرح بڑھتی چلی جائے اور نہ صرف ہم میں یہ روح رہے بلکہ ہماری نسلوں میں بھی منتقل ہوتی رہے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک دن یہ روح لاکھوں سے کروڑوں اور کروڑوں سے اربوں لوگوں میں پھیل جائے گی۔ لیکن اگر اس زنجیر کو ٹوٹنے دیا جائے، اگر یہ تعلق قائم نہ رہے تو چاہے بعد میں بعض ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں جو اپنے درجہ اور مقام کے لحاظ سے خلفاء سے بھی بڑھ کر ہوں پھر بھی وہ دنیا کو وہ ترقی نہیں دے سکیں گے جو آج جماعت احمدیہ کے افراد کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اکیلے ہوں گے اور آج ایک جماعت موجود ہے۔ اور اس کی وجہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہی ہے کہ نبی دنیا کے قلوب میں تغیر پیدا کرنے کے لیے آتے ہیں چند بڑے بڑے آدمی پیدا کرنے کے لیے نہیں آتے۔

پس یہ موقع جو آج لوگوں کو نصیب ہے اِس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہماری

جماعت کا اہم ترین فرض ہے۔ ورنہ جب یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو نہ صرف اپنی آخری عمر میں وہ اس حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے ہاتھ ملیں گے کہ کاش! ہم اس زمانہ سے فائدہ اٹھاتے بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کی طرف سے ان پر یہ شدید ترین الزام عائد ہو گا کہ انہوں نے اپنی آئندہ نسل کی بہبودی اور اس کی ترقی کے لیے وہ کچھ بھی نہ کیا جو ایک بد معاش دنیادار بھی اپنی اولاد کی ترقی کے لیے کیا کرتا ہے"۔(الفضل 15/ اپریل 1944ء)

---

1: المائدۃ 25

2: متی، باب 26، آیات 69 تا 74

3: اسد الغابہ جلد ثالث صفحہ 743 زیر عنوان عمرو بن العاص۔ دارالفکر بیروت لبنان 1998ء (مفہوماً)